بسم اللہ الرحمن الرحیم

عِلم و تاریخ

امام جعفر صادق علیہ السلام کی نظر میں

اقتباس از:

امام جعفر صادق علیہ السلام

اور

سائنسی انکشافات

۲۵ عالمی دانشوروں کی تحقیقات کا مجموعہ

پبلشر: موسسہء اہلِبیت علیہ السلام پاکستان

پیشکش: سید جہانزیب عابدی و اہلِبیت

علم امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

امام جعفر صادقؑ اس امر کی طرف متوجہ تھے کہ علم و ادب نہ صرف یہ کہ شیعوں کی مذہبی ثقافت کو طاقتور بناتا ہے بلکہ دیگر اقوام کے مقابل مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بھی ہے۔ چنانچہ علم و ادب نے دنیائے اسلام میں اس حد تک ترقی کی کہ چوتھی صدی ہجری علمی اور ادبی حیثیت سے سنہری صدی قرار پائی اور یورپ والوں نے بھی اسلامی علوم سے بہت فائدہ اٹھایا۔

امام جعفر صادقؑ سے پوچھا گیا کہ متعدد علوم میں کون سا علم دوسروں پر ترجیح رکھتا ہے تو آپؑ نے جواب دیا کہ کلی حیثیت سے تو کوئی علم دیگر علوم پر ترجیح نہیں رکھتا لیکن استفادہ کے مواقع ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ آدمی بعض علوم سے جلد تر اور زیادہ تر فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس دور کی انسانی زندگی میں دو علوم زیادہ فائدہ بخش ہیں ایک علمِ دین اور دوسرا علمِ طب۔

علمِ دین سے آپ کی مراد اس کی فقہ کا بیشتر حصہ تھا اور آپ بتانا چاہتے تھے کہ تمام علوم میں علمِ حقوق و فرائض اور علمِ طب آپ کے زمانہ میں مسلمانوں کے لئے زیادہ نفع بخش ہیں۔ نیز آپؑ نے فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے کہ جب انسان ان علوم سے بھی استفادہ کرے گا جن سے آج عملی فائدہ اٹھا رہا ہے اور یہ محال ہے کہ

کوئی علم عملی فائدہ نہ رکھتا ہو خلاصہ یہ کہ سارے علوم سے بنی نوع انسان کا عملی استفادہ زمانے کے تقاضوں پر منحصر ہے۔

امام جعفر صادقؑ کا عقیدہ تھا کہ نوع بشر نے اس دنیا کی اپنی طولانی زندگی میں بہت مختصر سے اوقات علم کے لئے وقف کئے ہیں اور زیادہ تر اس سے دور ہی رہا ہے۔ اسے دو چیزوں نے علم سے الگ رکھا ہے۔ اوّل مربّی اور معلّم کی غیر موجودگی جو اسے حصولِ علم کا شوق دلاتا اور دوسری انسان کی کاہلی اور یہ کہ علم حاصل کرنے میں چونکہ زحمت تھی لہٰذا وہ اس زحمت طلب کام سے بھاگتا رہا۔

اگر ہم مثال کے طور پر اس دنیا میں نوعِ انسان کی زندگی دس ہزار برس سمجھ لیں تو کہا جا سکتا ہے کہ آدمی نے اس طولانی مدّت میں سے صرف سو سال حصولِ علم میں صرف کئے ہیں، اگر اس سے زیادہ وقت اس کام میں صرف کیا ہوتا تو آج بہت سے علوم کے عملی فوائد سے بہرہ مند ہوتا۔

یہاں اس نکتے کا ذکر بے محل نہ ہو گا کہ اس دور کے علماء نے عبرانی تقویم سے مطلب اخذ کرتے ہوئے اس دنیا کی عمر چار ہزار سات سو سال سے کچھ زائد قرار دی تھی۔ اور ان کی نظر میں نوع بشر کی تازہ عمر اس سے کم تھی کیوں کہ پہلے دنیا پیدا کی گئی اس کے بعد انسان وجود میں آیا۔

لیکن جب امام جعفر صادقؑ نے مثال دینا چاہی تو آپ نے دس ہزار سال کا حوالہ دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ دنیا اور نوع بشر کے آغاز کے بارے میں عبرانی تقویم سے متفق نہیں اگرچہ کسی مثال کو دلیل نہیں سمجھنا چاہئے لیکن اس سے مثال دینے والے کے طرزِ فکر کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اگر آپ کا عقیدہ یہ ہوتا کہ نوع بشر کی عمر چار ہزار سات سو سال سے زیادہ ہے تو دس ہزار سال کا ذکر نہ کرتے بلکہ اس سے کمتر مثلاً تین ہزار سال کو شاہدِ مثال قرار دیتے۔

ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائشِ زمین کے بارے میں امام جعفر صادقؑ کی معلومات اپنے ہم عصروں سے زیادہ تھیں کیوں کہ کبھی کبھی آپ سے ایسی باتیں

سننے میں آتی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ آغازِ خلقت کی نوعیت سے باخبر ہیں۔ ایک روز آپؑ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا کہ تم پہاڑوں کے اوپر جو بڑے بڑے پتھر دیکھتے ہو یہ ابتدا میں پگھلے ہوئے مادے تھے جو سرد ہونے کے بعد اس شکل میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ ساڑھے بارہ سو سال قبل پیش کئے جانے والے اس نظریئے کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے یہ بتانا کافی ہو گا کہ انقلابِ فرانس کے آغاز اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک یورپی دانشمند اس شک اور شبہ میں مبتلا تھے کہ آیا زمین ابتدا میں ایک پگھلا ہوا مادہ تھی یا نہیں؟ اور اس سے ایک صدی پہلے سارے یورپ میں کوئی ایسا دانشور موجود نہ تھا جو یہ کہہ سکے کہ شاید زمین اپنے آغاز میں ایک پگھلا ہوا مادہ تھی ان کا خیال تھا کہ زمین اسی شکل میں پیدا ہوئی جس میں آج ہم کو نظر آ رہی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے حصولِ علم میں انسانوں کی کاہلی کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ ایک حقیقت ہے۔ آج انسان شناسی کے ماہرین کہتے ہیں کہ جب سے نسلِ انسانی دو پاؤں پر چلنے کے قابل ہوئی ہے اس کو پانچ لاکھ سال ہوئے ہیں۔ اس سے قبل اس سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ علوم کی جانب توجہ کر سکے کیوں کہ چار ہاتھ پاؤں پر چلنے کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ انسان آلات اور اوزار بنا کے صنعت میں داخل ہو اور اس ذریعہ سے علوم تک پہنچے۔ البتہ پانچ یا چار لاکھ سال میں جب سے یہ دو پاؤں پر چلنے لگا اور اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے تو یہ آلات اور اوزار بنانے پر قادر ہوا اور گزشتہ ایک لاکھ سال میں اس نے آگ سے فائدہ اٹھانے کا طریقہ بھی دریافت کر لیا۔ اگر ان ہی ایک لاکھ سال کے اندر اس نے علوم سے تعلق استوار کیا ہوتا تو آج زندگی کے سارے مسائل بلکہ شاید موت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا ہوتا۔ لیکن ان ایک لاکھ برسوں میں علوم کی جانب انسانوں کی توجہ مجموعی طور پر پندرہ سو سال سے آگے نہیں بڑھی اور اس مختصر مدت میں بھی انسان کی یہ توجہ گھٹتی بڑھتی رہی ہے۔

ایک چیز جو ہماری نظر میں ناقابلِ تردید معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ ڈکارٹ جس کے

دور کو تین صدیاں گزر رہی ہیں وہ پہلا شخص ہے جس نے جدید علمی تحقیق کی ابتداء کی اور کہا کہ علمی حقیقت تک پہنچنے کے لئے جسم کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنا چاہئے پھر ان کو اور بھی چھوٹے حصوں پر تقسیم کرنا چاہئے اور یہ سلسلہ قائم رکھنا چاہئے یہاں تک کہ سب سے چھوٹے جزو کو تقسیم نہ کیا جا سکے۔ اس کے بعد اس نے سب سے چھوٹے جسم پر تحقیق شروع کی۔ اس کے خواص کا پتہ لگایا اور دریافت کیا کہ طبیعاتی اور کیمیائی لحاظ سے اس کی نوعیت کیا ہے اور اگر جسم کے سب سے چھوٹے جزو کے خواص معلوم کئے جا سکیں تو خود اس جسم کے خواص بھی دریافت کئے جا سکتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں علمی ارتقاء کا بہت بڑا حصہ ڈکارٹ کے اسی نظریئے کی پیداوار سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اگر اس نے یہ نظریہ پیش نہ کیا ہوتا تو اس قدر علمی پیش رفت نہ ہوتی۔ یہ جان لینا چاہئے کہ جس چیز نے ڈکارٹ کے نظریہ کو مقبولیت بخشی وہ ساتویں صدی عیسوی کے بعد ٹیکنالوجی اور صنعتوں کی توسیع تھی۔ ڈکارٹ سے بائیس سو سال قبل یونان کے حکیم ذیم قراطیس نے کلی طور پر یہ نظریہ پیش کیا تھا۔

البتہ امام جعفر صادقؑ نے ذیم قراطیس کے نظریہ کی تشریح و توضیح کی اور فرمایا کہ اشیاء کے خواص ہم پر اسی وقت بخوبی ظاہر ہوتے ہیں جب ہم کسی چیز کے چھوٹے حصے پر باریک بینی کے ساتھ تحقیق کریں اور اس کے خواص سے بڑے جسم کے خواص کا پتہ لگائیں۔ ہمارے لئے دنیا کے سمندروں اور دریاؤں کے سارے پانی کے بارے میں تحقیق ممکن نہیں ہے لیکن اگر اسی پانی کے ایک قطرے پر تحقیق کریں تو ہمیں جو کچھ معلوم ہو گا اس سے پورے دریا کے خواص کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر صنعت اور ایجادات میں اتنی پیش رفت نہ ہوتی اور جسموں کو چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرنے کے وسائل دانشوروں کی دسترس میں نہ آتے تو ذیم قراطیس اور امام جعفر صادقؑ کے اقوال کے مانند ڈکارٹ کا قول بھی تھیوری کی حدود سے آگے نہ بڑھتا۔

اگر آج ایک ملی میٹر کے دس لاکھویں حصے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے تو یہ صنعتی ترقی ہی کی وجہ سے ہے ذیم قراطیس کے زمانے میں جو چیز آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی

تھی وہ ایٹم یا ناقابلِ تقسیم جزو تھا اور آج ایک ملی میٹر کا دس لاکھواں حصّہ بھی ناقابلِ تقسیم جزو نہیں ہے۔

امام جعفر صادقؑ سے جو دیگر سوالات کئے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی کو عالمِ مطلق کہا جا سکتا ہے؟ اور انسان کس موقع پر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے ہر چیز سیکھ لی ہے؟

آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس سوال کو دو حصّوں میں الگ الگ کر کے مجھ سے پوچھنا چاہئے۔ پہلا حصّہ جس کے متعلق سوال کر سکتے ہو یہ ہے کہ کس شخص کو عالمِ مطلق کہا جا سکتا ہے؟ تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ ذاتِ خدا کے علاوہ کوئی عالمِ مطلق موجود نہیں ہے اور کسی بشر کا عالمِ مطلق ہونا محال ہے کیوں کہ علم اس قدر وسیع ہے کہ کوئی شخص تمام دریافت طلب باتوں کو معلوم نہیں کر سکتا، چاہے وہ ہزاروں سال زندہ رہے اور اس طولانی مدت میں مسلسل حصولِ علم میں مشغول رہے۔

ہو سکتا ہے وہ کئی ہزار سال کی عمر میں شاید اس دنیا کے جملہ علوم سے واقف ہو جائے لیکن اس دنیا کے علاوہ اور دنیائیں بھی ہیں اور ان میں بھی علوم موجود ہیں۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے سارے علوم سیکھ کے دوسری دنیاؤں میں پہنچے تو وہاں کے لئے جاہل ہو گا۔ اور اسے سرے سے علم حاصل کرنا ہو گا۔ تاکہ ان دنیاؤں کے علوم سے واقف ہو سکے۔ یہی سبب ہے کہ ذاتِ خدا کے علاوہ اور کوئی عالمِ مطلق نہیں ہے اس لئے کہ نوعِ بشر میں سے کوئی فرد بھی جملہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا۔

آپ کے شاگردوں نے سوال کا دوسرا حصّہ پیش کیا اور پوچھا کہ انسان کس موقع پر علم سے غنی ہو جاتا ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ اس سوال کا جواب پہلے ہی جواب میں دیا جا چکا ہے اور میں کہہ چکا ہوں کہ اگر انسان ہزاروں سال کی عمر پائے اور برابر تحصیلِ علم میں مشغول رہے تب بھی سارے علوم کا احاطہ نہیں کر سکتا اس بنا پر کبھی بھی کوئی وقت ایسا نہیں آسکتا جب ایک شخص یہ محسوس کر سکے کہ وہ علم سے غنی ہے۔ صرف وہی

لوگ خود کو علم سے غنی محسوس کرتے ہیں جو جاہل ہیں۔ کیوں کہ جو شخص جاہل ہوتا ہے وہی خود کو علم سے بے نیاز جانتا ہے۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علم سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا کہ جس دنیا میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں اس کے علاوہ اور بھی ایسی دنیائیں موجود ہیں جو اس دنیا سے کافی بڑی ہیں اور اُس دنیا میں ایسے علوم ہیں جو یہاں کے علوم سے مختلف ہیں۔

آپؑ سے پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کی تعداد کتنی ہے تو جواب میں فرمایا کہ سوائے خدا کے اور کوئی ان کی تعداد سے واقف نہیں۔ پھر پوچھا گیا کہ دوسری دنیاؤں کے علوم اس دنیا کے علوم سے کس طرح مختلف ہیں؟ کیا علم سیکھنے کی چیز نہیں ہے؟ اور جو چیز سیکھنے کے لائق ہو وہ اس دنیا کے علوم سے مختلف کیوں کر شمار کی جا سکتی ہے؟

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ دوسری دنیاؤں میں دو طرح کے علم پائے جاتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو اس دنیا کے علوم سے مشابہ ہے اور اگر کوئی شخص یہاں سے وہاں جائے تو انہیں سیکھ سکتا ہے۔ لیکن بعض دنیاؤں میں ایسے علوم کی موجودگی کا امکان ہے جنھیں درک کرنے پر نوع انسانی کے دل و دماغ قادر نہیں ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کا یہ قول بعد میں پیدا ہونے والے دانشوروں کے لئے ایک معمہ بنا رہا۔ چنانچہ بعض اس کو قابلِ قبول نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ امام جعفر صادقؑ نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ لائقِ توجہ نہیں ہے۔ انہیں تردید کرنے والوں میں ابنِ راوندی اصفہانی بھی ہے۔ جس کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ عقلِ انسانی ہر اس چیز کے ادراک پر قادر ہے جو علم ہو، چاہے اس دنیا کے علوم ہوں چاہے دوسری دنیاؤں کے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں نے اپنے استاد کے قول کو تسلیم کیا اور اس بات کے قائل ہوئے کہ بعض دنیاؤں میں ایسے علوم موجود ہیں جنھیں افرادِ بشر حاصل نہیں کر سکتے کیوں کہ ہماری عقلیں انہیں سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتیں البتہ اس صدی میں جب آئین اسٹائین کی نسبیت کی تھیوری نے فزکس میں ایک بالکل جدید باب کا اضافہ کیا۔ پھر اس کے بعد وجودِ ضد مادہ کی تھیوری نے تھیوری

کی حدود سے آگے بڑھ کے علم کے مرحلے میں قدم رکھا اور دانشوروں پر ثابت ہو گیا کہ مادے کی ضد موجود ہے تو آپ کا قول سمجھ میں آگیا۔کیوں کہ ضدِ مادہ کی دنیا کے طبیعیاتی قوانین ہماری دنیا کے طبیعیاتی قوانین سے مختلف ہیں اور اس سے بالاتر منطق و استدلال کے اصول و قواعد ان کے علاوہ ہیں جن کے وضع اور ادراک پر ہماری عقل قدرت رکھتی ہے۔ دنیائے ضدِ مادہ ایک ایسا عالم ہے جہاں ایٹموں کے اندر الیکٹرانوں کی قوت مثبت اور پروٹانوں کی قوت منفی ہے۔ لیکن ہماری دنیا میں الیکٹران کی قوت منفی اور پروٹان کی مثبت ہے۔

جس دنیا میں الیکٹران کی قوت مثبت اور پروٹان کی قوت منفی ہے، معلوم نہیں وہاں کن طبیعیاتی قوانین کی حکمرانی ہے۔ ہماری منطق اور استدلال میں کُل جزُ سے برتر ہے لیکن اس دنیا میں ممکن ہے کہ جزُ کُل سے برتر ہو اور ہمارا دماغ اس پر قادر نہیں ہے کہ اس موضوع کو سمجھے اور قبول کرے۔

ہماری دنیا میں جس وقت کسی وزنی جسم کو پانی میں ڈبویا جاتا ہے تو وہ ارشمیدس (Archimedes) کے اخذ کئے ہوئے قانون کے مطابق ہلکا ہو جاتا ہے لیکن اس دنیا میں اگر کسی جسم کو پانی یا کسی اور سیال میں ڈبو دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وزنی ہو جائے۔ پاسکل (Blaise Pascal) کے قانون کے مطابق جب کسی ظرف کے اندر ایک سیال شے کے کسی ایک نقطے پر دباؤ پڑتا ہے تو وہ دباؤ اس سیال کے تمام نقطوں پر پہنچتا ہے چنانچہ اسی قانون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وسائلِ نقل و حمل اور بالخصوص وزنی وسائلِ نقل و حمل کے لئے تیل کے بریک بنائے جاتے ہیں اور بریک کے پیڈل پر ڈرائیور کے پاؤں کے دباؤ سے جو تھوڑا سا دباؤ تیل کے اوپر پڑتا ہے وہ چونکہ تیل کے سارے نقاط اور اجزاء تک پہنچتا ہے لہٰذا اس سے ہزار گنا زیادہ دباؤ چلتے ہوئے پہیوں پر پڑتا ہے۔ اور انہیں دم بھر میں ساکن کر دیتا ہے۔ لیکن فزکس کا یہ قانون ممکن ہے دنیائے ضدِ مادہ میں موثر نہ ہو اور جو دباؤ سیال شے کے ایک نقطے پر پڑتا ہے وہ اس کے دوسرے نقطوں پر اثر انداز نہ ہوتا ہو۔اگر کوئی شخص اس دنیا سے دنیائے ضدِ مادہ میں

پہنچے تو ممکن ہے کہ وہاں کے فزیکی (طبیعیاتی) قوانین کے ساتھ جو اس کے لئے خلاف عادت و معمول ہیں' بتدریج مانوس ہو جائے جیسا کہ خلا نورد خلائی راکٹوں میں زمین کے گرد گردش کرتے ہیں'یا چاند کے کرُے پر قدم رکھتے ہیں تو بے وزنی سے مانوس ہو جاتے ہیں کیوں کہ انہیں فضاء میں بھیجنے سے پہلے زمین ہی پر بے وزنی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عادی بنا دیا جاتا ہے۔

لیکن جن چیزوں کو آدمی دنیائے ضدِ مادہ میں قبول نہیں کر سکتا وہ ایسی چیزیں ہیں جو اس کے قوانینِ منطق و استدلال کے خلاف ہیں۔

اگر وہ اس دنیا میں جزو کو کل سے برتر پائے'اگر دیکھے کہ وہاں کے لوگ اعداد کے جمع و تفریق اور ضرب و تقسیم میں چار بنیادی عمل کے قواعد کا لحاظ نہیں رکھتے اور اگر محسوس کرے کہ وہاں حرارت پانی کو منجمد کر دیتی ہے اور برودت بھاپ بنا دیتی ہے بغیر اس کے کہ خلا کا کوئی وجود ہو تو وہ ان غیر عقلی مشاہدات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہی سبب ہے کہ اس دور میں امام جعفر صادقؑ کا یہ نظریہ کہ بعض دوسری دنیاؤں میں ایسے علوم بھی ہو سکتے ہیں جنھیں حاصل کرنے کی طاقت و صلاحیت انسان کے پاس نہیں ہے' قابلِ قبول نظر آتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ کے قول نے اس قدیم فلسفی بحث کو حیاتِ نو بخشی جو یونان میں علم کے بارے پیش کی گئی تھی۔ وہ بحث یہ ہے کہ آیا علم بذاتِ خود موجود ہے یا وہ ہے جو ہم استنباط کرتے ہیں یعنی طبیعی ہے؟

بعض یونانی دانشور کہتے ہیں کہ تنہا علم وجود نہیں رکھتا ہے۔ علم وہ چیز ہے جو ہم اشیاء اور حالات سے درک کرتے ہیں اور اس کے قواعد کے ذریعہ اس کا سراغ لگاتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ مادر زاد اندھا رنگوں کا علم حاصل نہیں کر سکتا اور مادر زاد بہرہ علمِ موسیقی کا ادراک کرنے پر قادر نہیں ہے۔

وہ کہتے تھے کہ صرف ایک یا دو ظاہری حواس کی کمی تمام علوم کے ادراک میں مانع نہیں ہے بلکہ حواسِ باطنی کی کمی بھی اس سے مانع ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک دیوانہ کسی قسم کا علم حاصل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا چاہے اس کے ظاہری حواس میں کسی

طرح کا نقص نہ پایا جاتا ہے۔

اس گروہ کے مقابل یونانی دانشمندوں ہی کی ایک جماعت کہتی تھی کہ مجرد علم موجود ہے، قطع نظر اس سے کہ انسان اس کا ادراک کرے یا نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جو علم دنیا میں چار فصلوں کو وجود میں لاتا ہے ۔ وہ موجود ہے چاہے انسان ان فصلوں کا ادراک کرے یا نہیں اور جو علم سورج اور چاند کو زمین کے گرد حرکت دیتا ہے وہ اپنا وجود رکھتا ہے۔ خواہ انسان کے پاس آنکھ ہو اور وہ آفتاب و ماہتاب کو دیکھ سکے یا مادر زاد اندھا ہو اور ان کا مشاہدہ نہ کر سکتا ہو۔

ذیم قراطیس جو یہ کہتا ہے کہ دنیا ایٹم سے وجود میں آئی ہے 'اس کا عقیدہ تھا کہ دو طرح کے علوم موجود ہیں ایک وہ جنھیں معلوم کیا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ جن کے قواعد و جزئیات کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ ان مجہول علوم میں سے ایک ایٹموں کا علم ہے۔ اور دوسرے خداؤں کے علوم ہیں۔

ذیم قراطیس کے سو سال بعد اس پر اعتراض کیا گیا کہ جب اس نے یہ بتایا کہ ایٹموں کا علم مجہول ہے اور انسان اس کے قواعد و جزئیات کو دریافت کرنے سے قاصر ہے تو اس نے یہ کیوں کر کہا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے؟ کیوں کہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو ایٹم کے علم اور اس کے قواعد و جزئیات سے آگاہ ہو۔ خود ذیم قراطیس تو موجود نہ تھا جو اس کا جواب دیتا۔ البتہ اس کے عقیدت مندوں نے کہا کہ اس کی عقل کہتی تھی کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے لیکن اس کے حواس اس پر قادر نہ تھے کہ وہ ایٹموں کا مشاہدہ کر سکے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جنھیں آدمی اپنی عقل سے تو سمجھ سکتا ہے لیکن حواس کے ذریعے انہیں محسوس نہیں کر سکتا۔ ذیم قراطیس کے ماننے والے اپنے استاد کے مخالفین کو خاموش کرنے کا ایک موثر وسیلہ رکھتے تھے کہ خدا کو نہ حواسِ ظاہری سے دیکھا جا سکتا ہے اور نہ سنا 'اور نہ حواسِ باطنی کے ذریعے اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ جس طرح ہم حواسِ باطنی کے وسیلے سے اپنی بیماری کا پتہ لگا لیتے ہیں بغیر اس کے کہ اسے دیکھیں اور اس کی آواز سنیں۔

ذیم قراطیس بھی اپنی عقل کے ذریعے اس نکتے تک پہنچا کہ دنیا ایٹموں سے وجود میں آئی ہے۔ اور اگر وہ ایٹم کے علم کے قواعد اور جزئیات کو دریافت نہیں کر سکا تو اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ یونانی دانشوروں میں بھی ایسے لوگ تھے جن کا کہنا تھا کہ علوم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کے ادراک پر بشری عقل قادر ہے۔ اور دوسرے وہ جو انسان کی دسترس سے باہر ہیں اور وہ اپنے شعور و عقل کے ذریعے ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔

مندرجہ بالا بحث سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اوّل تو امام جعفر صادقؑ علم کو غیر محدود سمجھتے تھے اور دوسرے آپ کا عقیدہ تھا کہ کچھ علوم دوسری دنیاؤں میں ایسے ہیں جنہیں انسان عقل و شعور کے ذریعے درک نہیں کر سکتا جیسے اس دنیا میں تحصیلِ علم کرتا ہے۔ آج آئین اسٹائین کی نسبیت کی تھیوری اور نظریۂ ضدِ مادہ کے بعد جس کے بارے میں ہم کہہ چکے ہیں کہ تھیوری کی حدود سے گزر کے علمی مرحلے میں داخل ہو چکا ہے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ساڑھے بارہ سو سال قبل امام جعفر صادقؑ نے ایک صحیح نظریہ پیش کیا تھا۔

عباسی دور کا ایک مشہور و معروف مورخ جس نے امام جعفر صادقؑ کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن ابی الحدید ہے جس کی موت عباسی خلافت کا دور ختم ہونے سے ایک سال قبل ۶۵۵ھ میں ستر یا ساٹھ سال کے سن میں ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوئی اور اس کا نام عزالدین عبدالحمید ابن محمد تھا یہ کہتا ہے کہ امام جعفر صادقؑ کی وفات کے بعد تقریباً ڈیڑھ یا دو سو سال کی مدت تک عربستان بین النہرین ' عراق و عجم و خراسان اور ایران میں جو مدّرس درس دیتا تھا وہ امام جعفر صادقؑ سے سند لینے کی کوشش کرتا تھا کہ امام جعفر صادقؑ سے اس طرح منقول ہے۔ پھر یہی مورخ کہتا ہے کہ اہلسنّت والجماعت کے فرقوں کے مدّرسین بھی درس دیتے وقت آپ سے روایت نقل کرتے تھے۔

ایک روز بنی عباس کے آخری وزیر ابن علقمی نے ابن ابی الحدید سے پوچھا کہ گزشتہ دور میں عالمِ اسلام کا سب سے بلند پایہ عالم اور دانشمند کون تھا تو اس نے جواب دیا کہ امام جعفر صادقؑ۔

چونکہ امام جعفر صادقؑ کو سب سے بڑا اسلامی دانشور مانا گیا ہے لہٰذا ایک محقق چاہتا ہے کہ آپ کے معیارِ علم (میزانِ معلومات) سے واقفیت حاصل کرے۔

شیعہ مورّخین کی کتابوں میں امام جعفر صادقؑ کے علوم کا شمار ایک سو سے پانچ سو تک کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شیعہ مورّخین کی ایک جماعت نے جس قدر آپ کے معجزات کے بارے میں لکھا ہے اس قدر آپ کے علوم کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔

شیعہ مورخین آپ کے اعجاز پر جو عقیدہ رکھتے تھے اس کی بنا پر ایران کے ایک گروہ کی کتابوں میں آپ کی سوانح کو آپ کے معجزات ہی کے ذیل میں لکھا گیا ہے اور ان کی بعض کتابوں میں تو آپ کے معجزات کی تفصیل سے کافی صفحات بھرے ہوئے ہیں۔

شیعہ مورخین کی ایک جماعت کی کتابوں میں معجزات کے شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً کوئی ایسا دن نہیں گزرتا تھا جس میں امام جعفر صادقؑ سے کوئی معجزہ رونما نہ ہوتا ہو۔

امام جعفر صادقؑ کے معجزات کا ایک حصّہ صفوی دور کے بہت بڑے عالم و فاضل علاّمہ مجلسیؒ کی کتاب بحار الانوار میں بھی درج ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں مجلسی نے جو کچھ بھی بحار الانوار میں لکھا ہے وہ دوسرے منابع سے اقتباس ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے معجزات کی تفصیل بیان کرنے والے شیعہ مورخین میں سے ایک ابو جعفر ابن بابویہ قمی ہیں یہ بزرگ جنہوں نے بہت مشہور کتاب مَن لایحضرہ الفقیہ لکھی، شیعوں کے بڑے علماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اور ان کا دورِ حیات چوتھی صدی ہجری تھا جو زمانے کے لحاظ سے امام جعفر صادقؑ کے قریب تھا۔

ابن بابویہ قمی نے معجزاتِ امام جعفر صادقؑ کے علاوہ اپنی ایک خاص کتاب "عیون اخبار الرضا" میں آپ کے پوتے امام علی ابن موسیٰؑ ابن جعفرؑ کے معجزات بھی

بیان کئے ہیں۔

چونکہ شیعہ مورخین امام جعفر صادقؑ کے لئے امامت کے قائل تھے لہٰذا ہم جیسا کہ پہلے بتا چکے ہیں ان میں سے بعض نے آپ کے علوم کی تعداد پانچ سو قرار دی ہے، بغیر اس کے کہ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ ذکر کریں۔

البتہ ایک تاریخی محقق جب یہ دیکھتا ہے کہ آپ پانچ سو علوم سے واقفیت رکھتے تھے اور ان سب کا درس دیتے تھے تو اس بات کو تسلیم نہیں کرپاتا کہ ایک انسان اتنے علوم کا حامل ہو گا۔

بے شک امام جعفر صادقؑ کے عہد میں علوم کی تعداد آج کی مانند نہ تھی اور آگاہی میں آج کی سی تیز رفتاری کے ساتھ اضافہ نہیں ہوا تھا اور ہنر کی وسعت اس بات کا سبب نہ بنی تھی کہ ایک کوتاہ مدت میں ایک علم سے دوسرے علوم وجود میں آجائیں۔

مثلاً ایٹم شناسی کے علم نے ایک قلیل مدت (۱۹۴۰ سے ۱۹۷۰ء) میں اس قدر وسعت اختیار کرلی ہے کہ آج ایک شخص نظری اور عملی لحاظ سے مکمل طور پر ایٹم شناس نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کی ناکافی عمر اس سلسلہ میں رکاوٹ ہے کہ وہ عملی اور نظری ہر دو لحاظ سے ایٹم شناسی کا ماہر ہوجائے۔ اگر وہ ایٹم شناسی کے نظری شعبہ کو پیشِ نظر رکھے گا تو عملی شعبہ اس سے رہ جائے گا اور اسی طرح اگر وہ عملی شعبہ کی جانب قدم بڑھائے گا تو نظری شعبہ میں پیچھے رہ جائے گا۔

اسی مثال کو ہم جنگی مسائل میں بھی لے سکتے ہیں۔ امریکہ میں ہوائی جنگ کے حوالے سے ایک نئی ٹیکنیک وجود میں آئی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے جنگی جہاز کو بغیر ہواباز کے اڑانا شروع کردیا ہے اور اس ٹیکنیک کی دریافت نے فضائی جنگ کی ٹیکنیک کو بدل دیا ہے اور فضائی جنگ میں ایک نئی ٹیکنیک دریافت کی ہے۔

لیکن ماضی میں ایسا نہ تھا اور علم و صنعت اس قدر تیز رفتاری کے ساتھ تغیر سے دوچار نہ تھے۔ آج کے دور میں شاید اصلی اور فرعی علوم کی تعداد ایک ہزار سے تجاوز کرچکی ہو لیکن ساڑھے بارہ سو سال قبل علوم کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہ تھی۔

شیعہ مورخین نے یہ جو کہا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم سے واقف تھے اور ہر ایک کی تدریس کرتے تھے' یہ مندرجہ ذیل دو عوامل کی بناء پر ہے۔

اوّل یہ کہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا کہ امام جعفر صادقؑ امام ہیں اور شیعہ عقیدہ کے مطابق امامؑ اس کائنات میں دانائے مطلق ہے۔ یاد رہے کہ ان کی نظر میں علمِ مطلق دو نوع رکھتا ہے۔

ایک عَلمِ مطلقِ خداوند اور دوسرا علمِ مطلقِ پیغمبرؐ کہ جو آنحضرتؐ کے بعد امام کو حاصل ہوتا ہے۔

خداوندِ عالم کے علم کے بارے میں وہ کسی حد کے قائل نہیں اور اسے علمِ مطلق سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس کا علم خود اس کی مانند لامحدود ہے اور خداوندِ عالم کا علم اس کی ذات سے جدا نہیں کہ اسے اکتسابی سمجھا جائے۔

تمام مسلمان' خداوندِ عالم کی تمام صفات کو بشمول اس کے علم کو اس کی ذات کا جزو سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوندِ عالم کوئی مبداء و منتہا اور آغاز و انجام نہیں رکھتا اور اس کا علم بھی ابتداء و انتہا اور حدود کا حامل نہیں۔

کیا خداوندِ عالم جانتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں اور کیا آگاہ ہے کہ وہ ازلی و ابدی ہے؟

مسلمان کا جواب ہے ہاں!

معترض کہتا ہے کہ اگر خدا جانتا ہے کہ آغاز نہیں رکھتا اور نہ ہی انجام کا حامل ہے تو اس نے خود کو کیسے پہچانا ہے؟ آیا شناسائی کے لئے لازم نہیں کہ مبداء اور منتہا سے واقف ہو؟

جواب ہے کہ جو علمِ مطلق ہو عین اس حال میں کہ جانتا ہے کہ اس کی مبداء و منتہا نہیں خود کو پہچانتا ہے کیونکہ علمِ مطلق ہماری کسی منطق کے قواعد کے قالب میں محدود نہیں ہوتا اور علمِ مطلق کہ جس کا مواد توانائیِ مطلق ہے اس قدر بسیط ہے کہ اس کو منطقی قواعد کے احاطہ اور نوعِ بشر کے استدلال میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

شیعہ جس دوسرے علمِ مطلق کے قائل ہیں وہ ہے پیغمبرؐ اور امامؑ کا علم۔ ان کا عقیدہ ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے علم کی حدود ان وظائف و ذمہ داریوں سے کہ جن کا خدا کی طرف سے ان کے لئے تعین ہوا ہے تجاوز نہیں کرتی ہیں اور دوسرے یہ کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کے علم کا پیمانہ خداوندِ عالم کے علمِ مطلق کے جیسا نہیں ہے۔

شیعوں کے درمیان ایسے عرفاء پیدا ہوئے جن کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کا علم خداوندِ عالم کے علم جیسا ہو سکتا ہے اور علم اور اس کے نتیجہ میں توانائی کے لحاظ سے خدا اور پیغمبرؐ اور امامؑ کے مابین کوئی فرق نہیں۔

لیکن شیعہ علماء نے کسی دور میں عرفاء کے اس نظریہ کو قبول نہیں کیا اور ہمیشہ خداوندِ عالم ہی کو خالق و عالمِ مطلق سمجھا ہے اور پیغمبرؐ اور امامؑ کو خداوندِ عالم کی مخلوق اور اس دنیا میں یعنی خداوندِ عالم کی خاص حدود کہ جس تک کسی اور کی فکر نہیں پہنچ سکتی کے سوا عالمِ مطلق سمجھا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ شیعہ علماء ہر دور میں اس بات کے معتقد رہے ہیں کہ امام اِس دنیا میں یعنی خداوندِ عالم کے لئے مخصوص حدود کے سوا علمِ مطلق کا حامل ہے اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو امامؑ نہ جانتا ہو اور نہ کر سکتا ہو علاوہ ان چیزوں کے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ شیعہ مورخین جو امام جعفر صادقؑ کو پانچ سو علوم کا حامل سمجھتے ہیں پہلے مرحلے میں اسی مذہبی عقیدہ کے زیرِ اثر رہے ہیں۔

دوسرا عامل جس نے انہیں اپنے زیرِ اثر لیا وہ امام جعفر صادقؑ کا نبوغِ علمی تھا کیونکہ انہوں نے علوم کے بارے میں امام جعفر صادقؑ سے جو کچھ سنا تھا وہ ثابت کرتا تھا کہ آپؑ علمی میدان میں ایک غیر معمولی ہستی ہیں اور جن مورخین نے آپ کے علمی تبحر کو دیکھا تھا وہ سمجھتے تھے کہ ایسی ہستی تمام علوم کی مالک ہے اور کیونکہ امام محمد باقرؑ سے حدیث بھی نقل ہوئی کہ "علوم کی تعداد پانچ سو ہے" لہٰذا بعض شیعہ مورخین نے تحریر کیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم جانتے اور ان کی تدریس کرتے تھے۔

ماضی میں دانشوروں کا طبقہ علم کی تقسیم کے بارے میں آج سے کہیں زیادہ سخی تھا

اور ہر علم کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔

علمِ اعداد جو آج ایک علم ہے دورِ قدیم میں آٹھ علوم میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اور عبارت تھا، جمع، تفریق، ضرب، تقسیم، جذر، کعب، تصاعد، جبر و مقابلہ۔ آج اس سب کو علمِ حساب کہا جاتا ہے اور لوگار تھم اور ٹرگنومیٹری اور حسابِ عالی بھی حساب ہی کا جزو ہوگئے ہیں اور سب کو ایک ہی علم شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح علومِ ادب میں، علم کے ہر جز کو ایک علم شمار کیا جاتا تھا۔ بحر کی شناخت ایک علم تھا اور قافیہ کی شناخت ایک اور علم اسم اولیٰ کو (علم بحور) رکھا گیا تھا اور دوسرے نام کو (علم قوافی)

بعض قدیم شعراء کسی ایک عرب شاعر کے تمام قصائد کو یاد کرنے کو بھی علم کہتے تھے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی عرب کے مشہور شاعر اعشی کے پانچ قصائد یاد کرلیتا تو دعویٰ کرتا کہ پانچ علوم کا حامل ہے۔

اس تقسیم بندی کے ساتھ تصدیق کی جاسکتی ہے کہ بعض شیعہ مورخین کے بقول امام جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کو جانتے تھے اور ان کی تدریس کرتے تھے لیکن علم کی اس تعریف کے مطابق جو آج کا ذوقِ سلیم کرتا ہے یہ بات قابلِ قبول نہیں کہ (اگر صرف انسانی لحاظ سے فیصلہ کیا جائے) جعفر صادقؑ پانچ سو علوم کے حامل تھے۔

جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ آج ایک علم ممکن ہے کئی فروعات کا حامل ہو جن میں سے ہر ایک علم شمار ہو۔ طب کا علم دسیوں فروعی علوم میں تقسیم ہے جس میں سے ہر ایک جداگانہ ہوتے ہوئے بھی دوسرے طبی علوم سے ربط رکھتا ہے۔

علمِ طب کا ایک شعبہ سرطان شناسی ہے کہ جو بہت وسعت اختیار کرگیا ہے لیکن جو سرطان شناس ہو اسے لازماً طب کے دیگر شعبوں مثلاً قلب شناسی، گردش خون (Blood Pressure) اور علمِ اعصاب کے بارے میں کلّیات سے واقف ہونا چاہئے کیونکہ انسانی بدن کے تمام حصے انسانی اعضاء کے کاموں کے اعتبار سے باہم وابستہ ہیں اور جب کوئی سرطان کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے خون کی گردش اور اعصاب پر بھی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ ارتباط کم و بیش دوسرے فرعی علوم میں بھی پایا جاتا

ہے۔

شیعہ علماء نے اسی دوسری صدی ہجری میں کہ جو امام جعفر صادقؑ کی صدی تھی آپؑ کے علوم کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کردیا تھا اور یہ طبقہ بندی اب تک موجود ہے۔

ان دو طبقوں میں سے ایک معقول ہے اور دوسرا منقول۔

آج علم کو ان شکلوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ علم منقول کو اس دور میں قبول نہیں کیا جاسکتا سوائے اس کے کہ ادب کو علم میں شمار کیا جائے۔

ادب کی گزشتہ انواع میں سے اب کوئی علم منقول پہلو کا حامل نہیں اور حتیٰ علمِ تاریخ مکمل طور پر منقول نہیں اور آج کا مورخ محض تاریخ کے اس حصے کو منقول سمجھتا ہے کہ جس پر عقلی لحاظ سے اظہار نظر نہیں کرسکتا۔

---☆---☆---

تاریخ امام جعفر صادقؑ کی نظر میں

شیکسپئر کے اشعار جو ادب کا جزو ہیں انہیں اسی صورت سے قبول کرنا چاہئے کیونکہ ایک منقول علم ہے لیکن آج کا مورّخ جنگِ واٹر لو کی تفصیلات کو منقول نہیں جانتا ہے۔ کیونکہ انہیں سمجھنے کے لئے عقل سے کام لیتا ہے جس طرح امام جعفر صادقؑ ساڑھے بارہ سو سال پہلے تاریخ کی تحقیق میں عقل استعمال کرتے تھے لہٰذا آپ تاریخ پر نقد و تبصرہ کے لحاظ سے آج کے مورّخ سے مختلف نہ تھے۔

یونانی مورّخ "ہروڈوٹ" نے اپنی تاریخ کے ایک مقدمے میں لکھا ہے کہ جس چیز کو عقل قبول نہیں کرتی میں بھی اسے قبول نہیں کرتا۔ حالانکہ اس تاریخ میں بھی خلافِ عقل اضافے پائے جاتے ہیں۔

اسلام میں امام جعفر صادقؑ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تاریخی روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور نشاندہی کی ہے کہ انہیں بغیر غور و فکر اور نقد و تبصرہ کے تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔ یہ آپ ہی تھے جو تاریخ لکھنے میں (ابن جریر طبری) کے استاد اور مربّی بنے اور جب ابن جریر طبری نے تاریخ نویسی کے لئے قلم اٹھایا تو اسے آپ ہی کی وجہ سے معلوم ہوا کہ وہی چیزیں لکھنا چاہئیں جنہیں عقل قبول کرلے اور ایسے افسانوں سے اجتناب برتنا چاہئے جنہیں سن کر لوگوں کو نیند آنے لگے۔

امام جعفر صادقؑ سے قبل مشرق وسطیٰ میں تاریخ ایک ایسی چیز تھی جس کے بہت

سے حصے افسانوں کی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ جو لوگ تاریخ سنتے یا پڑھتے تھے وہ اس کے افسانوں کو تسلیم کرتے تھے۔

ایک احتمال کے مطابق اسلام سے قبل ایران میں تاریخ اور تاریخی کتابیں موجود تھیں جن کا ایک صفحہ بھی آج دستیاب نہیں ہے۔

ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے جو مکتوبات دستیاب ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ایران میں یہ اصول رائج تھا کہ واقعات کو ضبطِ تحریر میں لاتے وقت قصّوں اور افسانوں کو تاریخ میں داخل نہیں کیا جاتا تھا۔

ہخامنشیوں اور ساسانیوں کے دور کے جو مکتوبات باقی رہ گئے ہیں ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو قصّے کہانیاں بیان کرتا ہو بلکہ ان میں معتبر واقعات درج ہوئے ہیں البتہ اُن کے اندر اِن کے بادشاہوں کے مذہبی اثرات ضرور جھلک رہے ہیں؛ جن کے حکم سے یہ لکھے گئے ہیں۔ اگر قدیم ایران میں اس عقلِ سلیم اور حسنِ تشخیص کا وجود نہ ہوتا کہ تاریخ میں قصّے کہانی کا دخل نہیں ہونا چاہیئے تو کم ازکم کسی ایک ہی باقی ماندہ تحریر میں کوئی افسانوی چیز نظر آتی۔

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مکتوبات چونکہ مختصر تھے لہٰذا ان میں اس کی گنجائش ہی نہ تھی کیونکہ ہخامنشی بادشاہ دار یوش اوّل کا مکتوب بہتون (بہستان۔ بیتون) اور ساسانی بادشاہ شاپور اوّل کا نقشِ رستم دونوں چھوٹے مکتوب ہیں اگر چاہتے تو ان میں افسانوں کا اضافہ کرسکتے تھے لیکن سوائے تاریخ کے اور کچھ درج نہیں کیا۔ بہرحال چونکہ ایران میں قبلِ اسلام کی تاریخ کی کتابیں باقی نہیں ہیں لہٰذا نہیں کہا جاسکتا ہے کہ ان میں افسانوں کا وجود تھا یا نہیں۔(۱)

۱۔ خدائی نامہ جو شاہنامہ فردوسی کا ماخذ بنا ایک روایت کے مطابق ساسانیوں کے دور میں لکھا گیا اور ہمیں معلوم ہے کہ اس میں صرف قصے کہانیاں ہی تھیں۔ اس کے تاریخی افسانے ایک روایت کے مطابق اشکانیوں کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ (فارسی مترجم)

دوسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں جو امام جعفر صادقؑ کا زمانہ کہا جاتا ہے افسانہ اور تاریخ باہم مخلوط تھے۔ ہم بتا چکے ہیں کہ دوسری صدی ہجری کا نیمۂ اوّل اسلام میں کتاب کے وجود میں آنے کا ابتدائی زمانہ ہے اور اس دور میں عربوں نے اپنے افکار کو قلمبند کرنے کے لئے نثر سے کام لیا۔ اس لئے کہ شبہ پیدا نہ ہو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس سے قبل عربوں میں نثر کا وجود ہی نہ تھا البتہ شاذو نادر تھا اور دوسری صدی ہجری کے نیمۂ اوّل میں عربی زبان میں نثر کے مختلف نمونے اس طرح سے سامنے آئے جیسے فصلِ بہار میں گل وبوٹے یک بیک نمو پاتے ہیں۔ ان میں بیشتر کتابیں آج باقی نہیں ہیں اور اِنہیں جنگوں' زلزلوں اور سیلابوں وغیرہ نے نابود کردیا ہے۔ لیکن ابن الندیم وراق کے طفیل ہم ان کے ناموں اور لکھنے والوں سے واقف ہیں نیز یہ کہ ان میں تاریخی کتابیں بھی تھیں لیکن تاریخ اس طرح لکھی جاتی تھی کہ افسانوں سے پاک نہیں ہوتی تھی۔

امام جعفر صادقؑ کسی ایسی کتاب کی تاریخی قدر و قیمت کے قائل نہیں تھے جس میں افسانوں کی آمیزش نظر آتی تھی۔ آپ کہتے تھے کہ افسانہ اور کہانی گمراہ کرتی ہے لہٰذا اسے تاریخ میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ اسی بناء پر آپ نے سب سے پہلے اسلام کی تاریخ پر نقد و تبصرہ کو رواج دیا اور بقول ابنِ ابی الحدید جس کو اسلام میں تاریخ اور فرانسیسی زبان میں "ہیستوار" کہتے ہیں سب سے پہلے امام جعفر صادقؑ نے وضع کیا۔

تاریخ کا لفظ عربی زبان میں تھا لیکن جس کتاب کو فرانسیسی زبان میں "ہیستوار" کے عمومی نام سے یاد کیا جاتا تھا' اس پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

اسلام سے قبل عربوں کے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس کا فن کے لحاظ سے تاریخ نام رکھتے۔ ان کی تاریخی روائتیں ہمیشہ اشعار کے قالب میں ڈھلتی تھیں۔ شعراء انہیں پڑھتے تھے اور سامعین یاد رکھتے تھے۔

اسلام کے بعد جب عربوں میں کتاب نویسی شروع ہوئی اور انہوں نے تاریخ کی کتابیں لکھیں تو ان کا عمومی نام تاریخ نہیں رکھا بلکہ انہیں روایت کہتے تھے کہا جاتا ہے

کہ "دساتیر" کے نام سے جو تاریخ فارسی میں لکھی گئی وہ بھی اسی دور میں فارسی دری زبان میں تحریر ہوئی۔

سوال یہ ہے کہ آیا دوسری صدی ہجری میں دری زبان اس قدر وسعت حاصل کر چکی تھی کہ اس میں دساتیر جیسی کتاب لکھی جائے؟ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ محققین کی ایک جماعت دساتیر کو ایک جعلی تاریخ سمجھتی ہے جو صفوی دور میں وضع کی گئی ہے۔

امام جعفر صادقؑ نے افسانے اور تاریخ کے سلسلے میں ایک ایسا نکتہ بیان کیا ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ آپ نے کم از کم اسلام میں تاریخ کو اجتماعی حیثیت سے فائدہ پہنچایا ہے۔

آپ نے فرمایا کہ جب تاریخ میں افسانہ شامل ہوجاتا ہے تو اس سے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

تاریخ سے واقفیت اس لحاظ سے مفید ہے کہ آنے والی نسلیں اسلاف کے حالات و واقعات سے نصیحت حاصل کریں اور جو کام نقصان دہ نظر آئیں ان سے پرہیز کریں۔

آج تاریخ کا سب سے بڑا فائدہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ آنے والے گزرے ہوئے لوگوں کے واقعات سے سبق حاصل کرتے ہیں اور ان کاموں کی طرف قدم نہیں بڑھاتے جنھوں نے اسلاف کو برباد کیا تاکہ ان کی طرح یہ بھی برباد نہ ہوں۔

اس زمانے میں آسٹریا کا مشہور فلسفی "فرائیڈ" جو روحانی امراض کا معالج بھی تھا تاریخ کے اس بڑے فائدے کی تصدیق کرتا تھا۔ البتہ کہتا تھا کہ بشری جذبات تاریخ سے عبرت حاصل کرنے میں مانع ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے ایک جذبہ خود غرضی کا ہوتا ہے اور خود غرضی انسان کو اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ جو افتاد اسلاف کے اوپر آئی اور انہیں برباد کیا وہ اس پر وارد نہ ہوگی کیونکہ یہ دوسرے زمانے میں زندگی بسر کررہا ہے اور اپنے اسلاف کے مقابلے میں زیادہ ہوشمند' ماہر اور طاقتور ہے۔

یہاں تک کہ اگر خود غرضی نہ ہو تب بھی بقول فرائیڈ دوسرے جذبات تاریخ سے

نصیحت حاصل کرنے میں حائل ہوتے ہیں۔ بہر حال افسانے کو تاریخ سے دور کرنے کے بارے میں امام جعفر صادقؑ نے جو کچھ فرمایا ہے اس نے اسلام میں تاریخ پر نقد و تبصرے کے مؤقف کو مستحکم بنایا اور علم تاریخ کو وجود بخشا۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے بتایا ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے بعض علوم اپنے والد امام محمد باقرؑ سے حاصل کئے لیکن بہت سے علوم جن کی آپ اپنی درسگاہ میں تعلیم دیتے تھے ایسے تھے جنہیں آپ خود اپنی تحقیق سے حاصل کرتے تھے۔ منجملہ ان کے یہ مسئلہ ہے کہ خاک بسیط نہیں ہے اور ہوا بھی بسیط نہیں ہوتی اور یہ وہ معلومات تھیں جنہیں خود امام جعفر صادقؑ نے دریافت کیا اور اپنے شاگردوں کو ان کی تعلیم دی۔ ہم جانتے ہیں کہ آپ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس بات کا پتہ لگایا کہ ہوا میں ایک ایسی شے موجود ہے جو آگ جلانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور وہی چیز دھاتوں کے فاسد ہونے کا باعث بنتی ہے۔

ہم نے امام جعفر صادقؑ کا یہ قول بھی پڑھا ہے کہ دوسری دنیاؤں میں دو طرح کے علم موجود ہیں ایک وہ جسے ہم اپنی عقل سے حاصل کرتے ہیں اور دوسرے وہ جسے شاید عقل سے سمجھنا ممکن نہ ہو۔ آپ ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ غالباً دوسری دنیاؤں سے ایسے علوم کے حامل جنہیں ہم نہیں جانتے' اس کوشش میں ہیں کہ ہمارے ساتھ رابطہ قائم کریں لیکن چونکہ ہم ان کے علم سے آگاہ نہیں ہیں اور ان کی زبان کو نہیں سمجھتے' لہٰذا ابھی تک نہیں جانتے کہ وہ ہم سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

امام جعفر صادقؑ کی نظر میں دوسری دنیاؤں کے موجودات حقیقی اور واقعی چیزیں ہیں کیونکہ قرآن مجید میں اِنس یعنی نوع بشر کے ساتھ ساتھ جِن کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ یعنی وہ موجودات جو نظر نہیں آتے۔ یہاں تک کہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب تمام انسان اور وہ موجودات جو نظر نہیں آتے ایک جگہ اکٹھا ہوں گے اور ایک ہی جماعت یا گروہ کی صورت میں جمع ہوں گے۔ لیکن امام جعفر صادقؑ سے قبل ان مخلوقات کے علوم کے بارے میں جو نگاہوں سے پوشیدہ ہیں یا دوسری دنیاؤں کے

موجودات ہیں اور یہ کہ ممکن ہے وہ انسانوں سے رابطہ کرنا چاہتے ہوں لیکن انسان ان کی زبان نہیں سمجھتا' کچھ نہیں کہا گیا اور آپ کے بعد بھی انیسویں صدی عیسوی تک کسی نے اس موضوع پر کوئی ایسی بات نہیں کی جو قابلِ توجہ ہو۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی میں فرانس کے کامیل فلا ماریون نے اس موضوع پر گفتگو کی اور نوع انسانی کے ساتھ دوسری دنیاؤں یعنی آسمانی کروں کے باشندوں کے ساتھ رابطے کے بارے میں بغیر کسی تجربے کے چند نظریئے پیش کئے کیونکہ اس وقت تک ٹیکنیک اس حد تک آگے نہیں بڑھ سکی تھی کہ وہ تجربے کے مرحلے میں داخل ہو سکتا۔

تجرباتی حیثیت سے ۱۹۲۰ء میں پہلی بار معلوم ہوا کہ دیگر دنیاؤں کے باشندے زمین والوں سے رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی سال اٹلی کا "مارکونی" عملی طور پر وائرلیس سے کام لینے والا پہلا شخص ہے۔ اٹلی کی بحری فوج کے افسران کی ایک میٹنگ میں جو اٹلی کے امیر البحر "کاونٹ میلو" کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی اس نے کہا کہ میں اپنے جہاز کے وائرلیس اسٹیشن پر کچھ لہریں وصول کر رہا ہوں جنہیں بلاشبہ کوئی ہوشمند اور صاحبِ علم و فن مخلوق کرۂ زمین پر بسنے والوں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے بھیج رہی ہے۔(۱۹۷۲ء میں امریکہ کے ہفتہ وار رسالے "ٹائم" نے جو علمی مقالات کو سلسلہ وار شائع نہیں کرتا تھا بلکہ اس کے تمام علمی مقالے ایک ہی شمارے میں مکمل ہو جاتے تھے کئی شماروں میں چند علمی مقالے شائع کئے جن کا بڑا حصہ دوسری دنیاؤں کے باشندوں کے ساتھ ارتباط کے بارے میں تھا اور اس رسالے نے زیادہ تر ان تجربات پر تکیہ کیا جو اب سوویت یونین میں دوسرے کروں سے رابطہ قائم کرنے کے لئے عمل میں آتے ہیں۔ اس نے کہا کہ روسی سائنس دان جو ریڈیو ٹیلی اسکوپوں کے ذریعے تجربات میں مشغول ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں رکھتے کہ دیگر کروں سے جو نظامِ شمسی سے باہر واقع ہیں اس دنیا کی باشعور مخلوقات کے لئے کچھ پیغامات بھیجے جاتے ہیں جنہیں زمین کے ریڈیو ٹیلی اسکوپ بھی وصول کرتے ہیں۔ البتہ ان پیغامات کا جواب دینے اور اس کے بعد دوسری دنیاؤں کے بافہم موجودات کی طرف سے جواب الجواب حاصل کرنے میں بقول

رسالہ "ٹائم" ایک زمانی مشکل ہے اور یہ کہ ہمارے لئے پیغام بھیجنے والی سب سے نزدیک دنیا بھی ہم سے ایک سو نوری سال کے فاصلے پر ہے لہٰذا روسی سائنس دان اگر آج اس کے پیغام کا جواب روانہ کریں تو یہ سو سال گزرنے کے بعد زمین کے نزدیک ترین ہمسائے تک پہنچ سکے گا اور پھر مزید ایک سو سال تک انتظار کرنا پڑے گا تاکہ اس کا جواب ہمارے یہاں موصول ہو سکے اور بقول مجلّہ "ٹائم" بعض پیغامات تو ایسی دنیاؤں سے آرہے ہیں جن کا فاصلہ زمین سے اس قدر زیادہ ہے کہ جس وقت ان کے پیغامات چلے ہوں گے شاید اس وقت تک کرۂ زمین پر بڑے جاندار بھی وجود میں نہ آئے ہوں' انسان کا تو ذکر ہی کیا؟

رسالہ "ٹائم" نے اپنے سلسلہ وار مقالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ انسانوں نے پہلی بار جب اپنے تجربے سے دریافت کیا کہ دوسری دنیاؤں میں بھی باشعور مخلوق موجود ہے تو ایسا ۱۹۲۰ء میں اٹلی کے مارکونی کے ذریعے عمل میں آیا اور اسی بناء پر امیر البحر کاونٹ میلو کی لڑکی نے مجلّہ ٹائم کو ایک خط لکھا جو اس کے ۲۱ مئی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں چھپا ہے اور وہ لڑکی آج مکمل عورت ہے' اس نے کہا ہے کہ وہ خود گواہ ہے کہ مارکونی نے اس کے باپ امیر البحر میلو سے کہا تھا کہ وہ اپنے جہاز "الترکرا" کے وائرلیس اسٹیشن پر دیگر دنیاؤں کے پیغامات وصول کرتا ہے

مارکونی بھی اپنے تجربے کو وسعت نہ دے سکا کیونکہ ابھی ریڈیو ٹیلی اسکوپ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور معمولی نوری ٹیلی اسکوپوں میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ نظامِ شمسی سے باہر کے کروں کا بخوبی مشاہدہ کر سکیں دوسرے یہ کہ معمولی ٹیلی اسکوپ ۱۹۲۰ء میں کمزور تھے اور اس وقت تک امریکہ کے کوہ "پالومر" کے اوپر قائم رصد گاہ کے ٹیلی اسکوپ کی بڑی دوربین جس کا قطر پانچ میٹر ہے نہیں بنی تھی کہ اس کے ذریعے ان کہکشانوں کا جو زمین سے دو ہزار ملین نوری سال کے فاصلے پر ہیں معائنہ کیا جاتا۔ (۱)

۱۔ اس دوربین کی تیاری ۱۹۳۶ء سے شروع ہوئی اور جب اس کا پگھلا ہوا مادہ بھٹی سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اس ٹیلی اسکوپ کے کام کے آغاز کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے ذریعے دوسری دنیاؤں میں رہنے والوں سے رابطہ قائم کرنے کا مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا' کوہ پالومر کی رصدگاہ کا یہ نوری ٹیلی اسکوپ اگرچہ کہکشانوں کو دیکھتا تھا جن کا فاصلہ زمین سے دوہزار ملین (دو ارب) نوری سال ہے لیکن انہیں آسمان میں ایک بڑے نقطے کی مانند مشاہدہ کرتا اور انکی وسعت و عظمت کا اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔



(گزشتہ صفحے کا حاشیہ)

نکال کر سانچے میں ڈالا گیا تو یہ طے کیا گیا کہ پگھلے ہوئے مادے کو جس کا درجہ حرارت بارہ سو ڈگری تھا۔ بتدریج سرد کیا جائے تاکہ دوربین میں کوئی بلبلہ اور شگاف پیدا نہ ہو۔ چنانچہ مخصوص ذرائع سے اس کی حرارت کو محفوظ کیا گیا اور ایک دن میں ایک ڈگری کے حساب سے گرمی کو کم کیا گیا یہاں تک کہ تین سال اور ایک سوپانچ دنوں میں وہ دوربین سرد ہوئی ' اس کے بعد اسے تراشنے والے کے سپرد کیا گیا۔ اس کے تراش کا پیمانہ ایک ملی میٹر کا ایک لاکھواں حصہ تھا۔ جو اس زمانے میں جب کہ ابھی دوسری جنگ عظیم شروع نہیں ہوئی تھی ٹیکنیک کا ایک نادر نمونہ شمار کیا جاتا تھا۔ بالآخر ۱۹۴۱ء میں جب امریکہ جنگ میں شامل ہوچکا تھا یہ دوربین کوہ پالومر کی رصدگاہ کے ٹیلی اسکوپ میں نصب کی گئی اور یہ نوری ٹیلی اسکوپ دوردراز کے ستاروں کا مشاہدہ کرنے کے قابل ہوا۔ اس وقت سے لے کر اب تک دنیا کے صنعتی ممالک نے بہت سی دلکش چیزیں ایجاد کیں۔ لیکن نوری ٹیلی اسکوپ سازی میں کوئی ایسی چیز تیار نہ ہوسکی جو کوہ پالومر کی آسمانی دوربین کا مقابلہ کرسکے۔ (مترجم فارسی)

التماس سورہ فاتحہ برائے بلندی درجات مرحومین

سید سرکار حیدر عابدی ابن سید صغیر حسین عابدی
شہید سید عنایت رضا رضوی ابن سید عنایت حسین رضوی
شہید سید عمران علی رضوی ابن سید ہادی علی رضوی
آیت اللہ العظمٰی سید ابن حسن نجفی ابن سید مہدی حسین
آیت اللہ العظمٰی سید مرتضی حسین نقوی صدر الافاضل ابن
مولانا سید سردار حسین نقوی
ثقۃ الاسلام طلعت سیدہ جعفری بنت سید حسن مثنی
سید صغیر حسین عابدی ابن میر مخدوم علی
سیدہ اقبال بیگم بنت میر مطلوب حسین
سید عنایت حسین رضوی ابن سید ثروت حسین رضوی
سید ساجد حسین رضوی ابن سید سجاد حسین رضوی
سیدہ اقبال جہاں بنت سید فدا حسین رضوی
سیدہ افسر جہاں بنتِ سید جواد حسین
سید تنویر السلام زیدی ابن سید اقبال حسین زیدی
سید ہادی علی رضوی ابن سید صادق علی رضوی
سیدہ عشرت جہاں عابدی بنت سید صغیر حسین عابدی
سید امین الحسن عابدی ابن سید علی حسین عابدی
سیدہ سکندر جہاں عابدی بنت سید صغیر حسین عابدی
سید کاظم علی زیدی ابن سید عابد علی زیدی
سید مظہر حسین عابدی ابن سید صغیر حسین عابدی

رضوانہ شمیم بنت شاہ ہادی عطا
مرزا وصی حیدر ابن مرزا محمد حیدر
سیدہ شمس آرا بیگم بنت سید محمد تقی زیدی
سید ظہور الحسن ابن سید سرفراز حسین
شاہجہان بیگم بنت محمد عباس
سیدہ صالحہ رضوی بنت سید سرفراز حسین رضوی
سید جلال حیدر جعفری ابن سید علی صغیر جعفری
سیدہ کنیز فاطمہ عابدی بنت سید ارتضاء جعفری
سید سعید حیدر رضوی ابن سید رئیس حیدر رضوی
سید علی کاظم جعفری ابن سید آل رضا جعفری
سید حسین عاصم جعفری ابن آل رضا جعفری
سید ہاشم جعفری ابن سید آل رضا جعفری
زینب صغریٰ بنت حسین احمد
سید حامد علی نقوی ابن سید ولی حیدر نقوی
سید شرافت علی نقوی ابن سید شجاعت علی نقوی
سیدہ شفیق زہرا بنتِ سید ممتاز حسین
سید قاسم رضا رضوی ابن سید علی مہدی
سیدہ جمال فاطمہ بنتِ سید شاہد حسین زیدی
سید فدا حسین رضوی ابن سید واجد حسین رضوی
سید فدا عباس رضوی ابن سید فدا حسین رضوی
سید فدا اصغر رضوی ابن سید فدا حسین رضوی
سید فدا اکبر رضوی ابن سید فدا حسین رضوی

محمد افضل حیدر ابن عبد الرشید
رئیس حیدر ابن محمد حیدر
محمد اجمل ابن محمد حیدر
محترمہ احسن جہاں بنتِ علی سجاد
سکندر عالم ابن جعفر حسین
علی حسنین ابن عارف حسین
آسیہ بیگم بنت سید کفایت علی نقوی

اپنی دعاؤں میں ان مرحومین کو بھی یاد رکھیں
جن کے لواحقین موجود نہیں اور کوئی ان کیلئے
دعا کرنے والا نہیں ہے۔